⊙ سمیرا شفیع
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد
⊙⊙ ڈاکٹر محمد آصف اعوان
صدر شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

احسان دانش کے شخصی مرثیے

Abstract:

Ehsan Danish was born in U.P Kandhla, in 1914. Being poor he used to do various jobs after Primary education, but along with it he continued his personal education too. Due to attending Poetic processions he soon became renowned as famous poet of Sub-Continent. Ehsan Danish is the poet of Revolution but he also did romantic poetry too. In his poetry there is also depiction of the problems of modern life. Ehsan Danish also work elegiac poetry on the death of his friends and famous personalities of his era. These elegiac poetry transcripts throw light on the philosophy of death and are full of tears as well. Ehsan Danish efforts to give an honorable place to the elegiac poetry.

Keywords:

Ehsan Danish Poetry Revolution Religious elegiac

ادبی حلقوں میں احسان دانش کے نام سے شہرت حاصل کرنے والے شاعر کا نام احسان الحق اور تخلص احسان تھا۔ان کی ولادت یو پی کاندھلہ میں ۱۹۱۴ء میں ہوئی اُن کے والد قاضی دانش علی ایک درویش منش اور بلند کردار انسان تھے۔ان کا گھرانہ انتہائی غریب تھا بمشکل پرائمری تک تعلیم حاصل کر سکے۔روزگار کی تلاش میں مختلف اوقات میں مختلف نوکریاں کیں۔احسان دانش نے محنت مزدوری کو بھی کبھی عار نہ سمجھا اور رزقِ حلال کے لیے سخت تگ و دو کرنے کے ساتھ ساتھ ذاتی مطالعہ بھی جاری رکھا جس کے نتیجے میں اُن کا مطالعہ وسیع ہوتا چلا گیا اور شعر و سخن سے دل چسپی بڑھتی چلی گئی۔مشاعروں میں شرکت کرنے کی وجہ سے اُن کی شہرت برصغیر پاک و ہند کے نمایاں اور معروف شعراء میں ہونے لگی۔ اُن کا سب سے پہلا مجموعہ حدیثِ ادب کے نام سے شائع ہوا۔باقی مجموعوں میں چراغاں،آتش خاموش ،جادئہ نو ،فصل سلاسل،دردِ زندگی اور میراثِ مومن شامل ہیں۔ان کی خودنوشت کی پہلی جلد جہانِ دانش اور

دوسری جلد جہانِ دگر کے نام سے شائع ہوئی۔

احسان دانش بنیادی طور پر شاعرِ انقلاب ہیں، اُن کی شاعری کا موضوع وہ مفلوک الحال طبقہ ہے جو ننگا اور بھوکا ہے جو جھونپڑیوں میں زندگی کی تلخیوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ زندہ رہنے کی دھن میں سسک رہے ہوتے ہیں اور بے رحم سماج کے ہاتھوں زندہ درگور ہوتے ہیں۔ واقعات اور مناظر کو ہو بہو پیش کرنا احسان دانش کا خاص فن ہے:

شیش محلوں سے ہمیں اپنے گھروندے ہیں عزیز
ان میں انسان کا لہو صرف چراغاں تو نہیں (۱)

احسان دانش نے رومانی نظمیں بھی کہی ہیں حسن و عشق کی دنیا میں اُن کا عجیب والہانہ انداز ہوتا ہے۔ شاعرانہ کیف و اثر میں ڈوبے ہوئے اشعار اُن کی نظموں میں کافی مل جاتے ہیں:

ہم چٹانیں ہیں کوئی ریت کے ساحل تو نہیں
شوق سے شہر پناہوں میں لگا دو ہمیں (۲)
کون دیتا ہے محبت کو پرستش کا مقام
تم یہ انصاف سے سوچو تو دعا دو ہم کو (۳)

ترنم اُن کے کلام کی خاص خوبی ہے احسان دانش کو لطیف اور نادر تشبیہات و استعارات کے استعمال پر بھی قدرت حاصل ہے مگر اُن کی زبان سادہ ہے۔ سیدھے سادھے مگر دل کش و مانوس الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ فارسی تراکیب اگر استعمال کی ہیں تو برمحل ہیں زبان کو بوجھل نہیں ہونے دیا۔

احسان دانش نے غزل و نظم دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے قدیم اور جدید دونوں رنگوں کو شاعری میں سمویا ہے۔ نظم میں اُن میں سیاسی اور سماجی شعور کا احساس زیادہ پختہ ہے اُن کے ہاں جدید مسائل کی عکاسی بھی نظر آتی ہے اور دوسرے شعراء سے نسبتاً زیادہ گہرا رنگ لیے ہوئے ہے:

اس مشینی دور میں درکار ہیں پتھر کے جسم
کارخانوں کے دھوئیں میں حل ہوا جاتا ہوں میں (۴)

احسان دانش کی شاعری میں ہمیں گیت بھی ملتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے دور میں انتقال پا جانے والے دوست احباب اور اہم شخصیات کے مرثیے بھی تحریر کیے ہیں۔ شخصی مرثیہ نگاری کی روایت میں انہوں نے ایک قابل قدر ذخیرہ چھوڑا ہے۔ یہ مرثیے موت کے فلسفے پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ آہوں اور آنسوؤں سے لبریز ہیں۔ ان پر دل سوزی اور دردمندی کے گہرے نقش موجود ہیں۔ انہوں نے اپنی جادو بیانی سے کام لے کر جدید شخصی مرثیے کو باوقار مقام دلوانے میں کامیاب سعی کی ہے۔

مرگِ تہور

شور! کیوں مرگِ تہور سے اتنا مضمحل
جب سمجھتا ہے کہ راہ پر خطر ہے زندگی

موت پر افسوس ہے توہین فطرت میں شمار
مصلحت بینی سے مصروف سفر ہے زندگی
وقت سے پہلے ہی مستقبل کو دیتی ہے صدا
کتنی گستاخ و شریر و بے بصر ہے زندگی
نالہ و شیون بجز احساس مجبوری نہیں
ہے وہی عالم وہی شام و سحر ہے زندگی
تیری غفلت سے طواف آب و گل کرتی رہے
ورنہ آزادِ قیودِ بحر و بر ہے زندگی
راز پا جائے تو باب مرگ پر سجدے کرے
زندگی کی عظمتوں سے بے خبر ہے زندگی
شام مرقد سے بہت نزدیک ہے صبح ابد
اس سے پہلے زندگی سے دور تر ہے زندگی
اس کی پروازیں فرشتوں کے نصیبوں میں کہاں
آگ و گل سے ماوراء چیزے دگر ہے زندگی
یہ تیرا عزم تبسم ناروا ہے یارو
جب سراسر صورت رقص شرر ہے زندگی
ہوشیار اے زندگی پر مٹنے والا ہوشیار
اِک جھلک ہے بزم عالم اِک نظر ہے زندگی (۵)

احسان دانش نے یہ مرثیہ اپنے ایک دوست اسحاق خان شور کے بھائی کے انتقال پر لکھا تھا جس نے کم عمری میں داعی اجل کو لبیک کہا تھا۔ مرثیہ غزل کی ہیئت میں لکھا گیا ہے اور اس مرثیے کے دس شعر ہیں۔ مرثیے میں قافیہ اور ردیف دونوں موجود ہیں۔ مرثیے کے آغاز میں انہوں نے اپنے دوست کا نام لے کر اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ تم اس موت پر اتنا مضطرب اور بے چین کیوں اور اس قدر کمزور کیوں ہوتے جا رہے ہو، یہ بات تم جانتے ہو کہ زندگی کا راستہ نہایت کٹھن اور دشوار ہے۔

دوسرے شعر میں انہوں نے نہایت گہرائی سے یہ نقطہ اُٹھایا ہے کہ موت پر اظہار افسوس کرنا فطرت کے اُصولوں کی توہین کے مترادف ہے کیوں کہ زندگی اور موت لازم وملزوم ہیں۔ زندگی کو اپنے بارے میں کچھ خبر نہیں ہے مگر پھر بھی مستقبل کے منصوبے تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ گستاخی اور ناسمجھی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ زندگی کی حدود وقیود سے موت قطعی طور پر آزاد ہے۔ شاعر کے خیال میں موت اک نئی زندگی کا آغاز ہے اسی لیے اُس نے کہا کہ اگر ہم موت کی عظمت کو سمجھ جائیں تو ہم اُس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔ زندگی کی شام ہونے پر جب ہم قبر میں بسیرا کرتے ہیں تو دراصل

وہیں ایک دائمی صبح کا آغاز ہوتا ہے۔شاعر نے یہاں صنعت تضاد استعمال کرتے ہوئے صبح اور شام کا استعمال نہایت برمحل کیا ہے۔ پھر شاعر نے فرشتوں کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ اُن کی قسمت میں موت کی حقیقت نہیں ہے۔ یہ صرف آب وگل سے ہی تعلق نہیں رکھتی ہے بلکہ ان سب سے ماورا ہے۔زندگی کی حقیقت تو ایک شرر سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے جس کا جلوہ یا رقص ایک لمحے سے بڑھ کر نہیں ہوتا ہے۔

آخری شعر میں شاعر نے کہا زندگی سے محبت کرنے والے انسان ہوشیار ہو جاؤ کیوں کہ اس دنیا کا ہنگامہ اور رونقیں ایک جھلک سے بڑھ کر کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔زندگی کی مثال ایک نظر سے زیادہ نہیں ہے۔شاعر نے اس شخصی مرثیے میں شخصی اوصاف اور جدائی کے کرب ناک لمحات کو موضوع بنانے کی بجائے موت کے عظیم فلسفے پر قلم اُٹھایا ہے اور مختلف زاویوں سے اس ابدی حقیقت کو بیان کرنے کی سعی کی ہے۔یہ خوبی اسے دیگر مرثیوں سے ممتاز کرتی ہے۔اسی خوبی کی وجہ سے اس شخصی مرثیے میں تنوع پیدا ہو گیا ہے۔

بت کدہ سے حرم تک

(مہاتما گاندھی کے حادثۂ موت کی خبر سن کر)

غضب ہے رخصت ساقی سے میخانے پہ کیا گزری
صراحی کا ہوا کیا حال پیمانے پر کیا گزری
چراغ انجمن سمجھا نہ اہل انجمن سمجھے
کہ جب پہلی کرن پھوٹی تو پروانے پہ کیا گزری
یہ پوچھے کوئی اس گرد و غبار بے تحاشا سے
کہ دیوانے کے گم ہونے سے ویرانے پہ کیا گزری
میں تنہا کیا ادب دان سیاست سب سمجھتے ہیں
کہ عنوان کٹ جانے سے افسانے پہ کیا گزری
جنون شوق کا اندازہ فرزانوں سے کیا ہوگا
یہ دیوانے سمجھتے ہیں کہ دیوانے پہ کیا گزری
جو پروانوں میں ہمت ہو تو گل کر دیں چراغوں کو
مگر یہ چیختے پھرتے ہیں پروانے پہ کیا گزری
ہے اس کی زد میں آبادی بھی ایوان قیادت بھی
یہ آندھی تند رفتاری سے ویرانے پہ کیا گزری
یہ رسم انجمن ہے تقاضا خونِ ناحق کا
کہ خود ماتم کناں ہے شمع پروانے پہ کیا گزری
یہ مرگ قیس اک دھبا ہے تاریخ بیاباں پر

جو ذرہ ہے پریشاں ہے کہ ویرانے پہ کیا گزری
مبارک زندگی ہی کو مبارک موت ملتی ہے
عدو بھی کہہ رہے ہیں ہائے بیگانے پہ کیا گزری
اے دانش مری اُجڑی ہوئی آنکھیں سمجھتی ہیں
عزیزانِ گرامی کے اُجڑ جانے پہ کیا گزری (۶)

یہ مرثیہ ہندوستان کے عظیم لیڈر مہاتما گاندھی کے حادثۂ قتل پر لکھا گیا ہے۔ شاعر نے عنوان کے نیچے بریکٹ میں یہ تحریر کر دیا ہے کہ مہاتما گاندھی کے انتقال کی خبر سن کر شاعر نے جو کرب محسوس کیا ہے اُس کو صفحۂ قرطاس پر اُتارا گیا ہے۔ مہاتما گاندھی ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۸ء میں اُن کا انتقال ہوا۔ اُن کو 'مہاتما' اور 'باپو' خطاب دیا گیا جس کا مطلب ہے عظیم روح کا حامل انسان، وہ ہندوؤں کی ایک معزز ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے عوام کو شعور دیا کہ پرامن رہ کر قوت و ظلم کا مقابلہ کرنے کے لیے جدوجہد کریں۔ سیاست میں سرگرم لیڈر کی حیثیت سے پیش پیش رہے، کئی بار گرفتار ہو کر جیل گئے۔ ۱۹۴۴ء میں خرابی صحت کی وجہ سے جیل سے رہائی ملی، تقسیم ہند کے وقت جو قتل عام ہوا اُس کے خلاف آواز بلند اور بھوک ہڑتال بھی کی لیکن ۳۰ رجنوری ۱۹۴۸ء کو رجعت پسند ہندوؤں میں سے مسٹر گاڈسے نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

ہندو قوم نے آج تک اتنا بڑا سیاسی رہنما پیدا نہیں کیا۔ اسی حادثے کو احسان دانش نے اس مرثیے میں موضوع بنایا ہے یہ بارہ اشعار پر مشتمل شخصی مرثیہ ہے جس میں غزل کی ہیئت کو اپنایا گیا ہے' کیا گزری' ردیف ہے اور قافیے کا اہتمام بھی ہے۔ شاعر نے اس غزل نما مرثیے کا چونکہ عنوان' بتکدہ سے حرم تک' رکھا ہے۔ اسی مناسبت سے تمام اشعار میں ایک ربط موجود ہے جیسے پہلے شعر میں ساقی، میخانے، صراحی اور پیانے جیسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور شعر میں گاندھی کو ساقی سے تشبیہ دی گئی ہے اور کہتے ہیں گاندھی جیسے بڑے لیڈر کی قائدانہ صلاحیتوں سے اُس قوم پورے طور بہرہ مند نہیں ہوسکی۔ احسان دانش کہتے ہیں ہندوستان کی سیاسی فضا میں گاندھی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ انہوں نے تشبیہ و استعارہ کے پردے میں اُن کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ اُن کی قوت سے صحرا اور گرد و غبار بھی پریشان ہے کہ اُس کو رونق بخشنے والا دیوانہ دنیا رُخصت ہو گیا ہے اور پھر کہتے ہیں صرف میں ہی نہیں بلکہ تمام اہل نظر اور اہل سیاست یہ بات بخوبی سمجھتے ہیں کہ سیاست کی ساری کہانی گاندھی کے دم سے آگے چل رہی تھی۔ اُن کے انتقال نے کہانی کے عنوان ہی کو ختم کر دیا ہے۔ اہل عقل اس نقصان کا اندازہ کیا کریں گے۔ یہ اہل جنوں ہی سمجھ سکتے ہیں۔

احسان دانش کہتے ہیں کہ گاندھی جیسے دیگر پروانے اس قتل پر شور و غل کر رہے ہیں اُن کو تو چاہیے کہ اُس شمع ہی کو گل کر دیں جس کے عشق میں پروانے جان سے گزر رہے ہیں۔ اس حادثے سے پورے ملک اور ایوان اقتدار کے در و دیوار ہل گئے ہیں۔ پھر وہ سوالیہ انداز میں سوال کرتے ہیں کہ یہ ناحق قتل کی وجہ ہے کہ بیچاری شمع بھی اس پروانے کی موت پر افسردہ اور سوگوار ہے۔ شاعر نے یہاں ماتم کناں کی ترکیب استعمال کی ہے جو کہ نہایت برمحل ہے۔ اگلے شعر میں گاندھی کی موت کو تاریخ عالم پر ایک سیاہ دھبا قرار دیا ہے اور کہا کہ گاندھی بھی قیس مجنوں کی طرح اپنے وطن کا سچا عاشق تھا

جس کی موت پر صحرا یعنی وطن کا ہر ذرہ سوگوار ہے۔ گاندھی کی موت کو انہوں نے نہایت مبارک قرار دیتے ہوئے کہا کہ جو زندگی میں اچھے کام کرتا ہے اُس کی موت بھی مبارک اور اچھی ہوتی ہے۔ گاندھی کے دشمن بھی اُن کی تعریف کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ ان کی کمی کو شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ مقطع میں احسان دانش نے کہا ہے کہ اس حادثے نے میری روح کو پریشان کر دیا ہے اور میری آنکھیں اس دُکھ اور کرب کو بیان کر رہی ہیں جو اُن کے جانے سے میں نے محسوس کی ہے۔ احسان دانش نے اس مرثیے میں جو غم کی تاثیر دکھائی ہے اُن کے اندازِ سخن نے اس قومی حادثے کو ایک جامع مضمون کی حیثیت عطا کر دی ہے۔ شخصی مرثیہ نگاری بھی ایک ہنر ہے جسے احسان دانش نے خصوصی توجہ دے کر ممتاز کر دیا ہے۔

مرگِ اکرم پر

اے جہان آباد اے ماتم سرائے کائنات
اے سراب دل نشین اے بزم زندان حیات
اے عروجِ پست منزل اے فروغ بے ثبات
اے گنہ زار حسین اے رہزن راہِ نجات
اے سرور غم فزا اے انبساطِ جانستاں
اے الم پرور چمن نیرنگی دور جہاں
تیرے ہر ذرے کا سینہ مقتل روح اُمید
تیری شام نحس زیر پرت روزِ سعید
تیری محویت میں چھن جاتی ہے جنت کی کلید
تیری ماتم گناہ میں شورش ہل من مزید
تیری آبادی میں طوفانِ تباہی موجزن
تیری تنویروں میں عصیاں کی سیاہی موجزن
موت جب کرتی اِک اُٹھتے جواں کو پائمال
یعنی ہوتا ہے کسی لاڈلے کا انتقال
قبر پر رونے کو ماں جاتی ہے برقع سر پر ڈال
سینہ کوبی کرکے ہوتی ہے نئی بیوہ نڈھال
پارہ پارہ غم سے بھائی کا جگر پاتا ہوں میں
غم کدے کو قبر سے تاریک تر پاتا ہوں میں
تو مگر رہتا ہے اے زندانِ روحانی وہی
شان رکھتی ہے تیری فرعون سامانی وہی
دیکھتا ہوں شب کو تاروں میں تابانی وہی

چودھویں کے چاند میں پاتا ہوں تابانی وہی
تیرے قانون وفا سوزی میں فرق آتا نہیں
کیوں زمیں ہلتی نہیں کیوں چرخ تھرّاتا نہیں
جہاں دن گزرے کہ اے ہنگامہ آراء ہاؤں ہو
اِک درخشندہ قمر جان بزم آرزو
روح کو تھی نغمہ داد جس کی گفتگو
ہر نفس تھا غیرت موج نسیم مشکبوہ
آج یہ ہے مرگ اکرم کی خبر سنتا ہوں میں
اعداد اے جذبہ یعقوب ، سر دھنتا ہوں میں
یہ سمجھتا ہوں کہ اب آنسو بہانا ہے عبث
دن کو خاموشی شبوں کو تلملانا ہے عبث
نالہ و فریاد عالم کو سنانا ہے عبث
آپ رونا اور لوگوں کو رُلانا ہے عبث
اس لیے روتا ہوں انساں کس قدر مجبور ہے
نالہء وا ماندہ ہے اورباب اجابت دور ہے (۷)

احسان دانش نے اس مرثیے کا عنوان ’مرگ اکرم پر‘ رکھا ہے کیونکہ انہوں نے ذیلی حاشیے میں بتایا ہے کہ اکرم میرا عزیز ترین تھا جو ایف سی کالج میں بی اے کا طالب علم اور عمر کی انیسویں بہار میں راہی عدم ہو گیا۔ مرثیے کی ہیئت مسدس ہے اس مرثیے کے نو بند ہیں، مسدس ہیئت کو بہت سے نمائندہ شعرا نے استعمال کیا ہے جس میں حالی اور اقبال قابل ذکر ہیں۔ اس مرثیے میں بھی شاعرانہ تخلیق کا جوہر نمایاں ہے۔ مرثیے کے آغاز میں دانش نے موت کی چیرہ دستیوں کو موضوع بناتے ہوئے کہا کہ یہ پوری دنیا ایک ماتم سرائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا ایک خوب صورت سراب ہے اور زندگی موت کے قید کانے میں جکڑی ہوئی ہے۔ ہر عروج کو زوال ہے، بے ثباتی کو فروغ حاصل ہے۔ موت کو ایک رہزن سے تشبیہ دی ہے۔ غم ہی ہر لطف وسرور کی انتہاء ہے، یہ چمن ہر کسی کو الم وذکھ دیتا ہے، اس غم سے اس چمن کی رنگارنگی قائم ہے۔

اگلے بند میں وہ کہتے ہیں کہ دنیا کے ہر ذرے کا سینہ اُمید کا مقتل ہے۔ یہاں ہر مبارک اور خوش وخرم دن کا انجام ذکھ کی نحوست پر ہے مگر پھر بھی دنیا میں رہ کر ہم اس قدر مگن ہو جاتے ہیں کہ آخرت میں جنت میں داخل ہونے کی کنجی دنیا میں ہی کھو جاتے ہیں۔ دنیا میں ہر طرف ماتم وسوگ کے باوجود ’ہل من مزید‘ کی صدائیں گونج رہی ہیں اور دنیا کی آبادی میں موت کی تباہی کے آثار چھپے ہوئے ہیں۔ یہاں دن کی تابشوں میں بھی گناہوں کی سیاہی موجزن ہے۔ ان کے خیالات کے بعد احسان دانش نے اپنے دوست کی موت پر نہایت غم انگیز انداز میں قلم اُٹھایا ہے کہ موت تو بے رحم ہے مگر جب کسی نوجوان کو وہ اپنے آہنی پنجے میں دبوچتی ہے تو یہ نہیں دیکھتی کہ یہ نوجوان کسی خاندان کا لاڈلا اور پیارا ہے۔ اُس

نوجوان کی ماں جو اُس کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہے اُس کے جوان ہونے کا انتظار نہایت اُمید کے ساتھ کرتی ہے مگر موت کا کاری وار اُسے برقع اوڑھے اُسی بیٹے کی قبر پر ماتم اور رونے دھونے پر مجبور کر دیتا ہے اور اُس کی نئی دلہن کا مقدر سینہ کوبی ہی رہ جاتی ہے اور اُس نوجوان کا بھائی کا دل وجگر شدت غم سے پھٹ جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ گھر موت کی وجہ سے اس قدر تاریک ہو جاتا ہے کہ قبر کی تاریکی بھی اُس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے مگر شاعر اس امر سے نہایت پریشان ہو جاتا ہے کہ اس زندان نما دنیا میں اتنے بڑے سانحے سے کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔

شاعر نے اگلے مصرعے میں موت کے ظلم کو فرعون کے ظلم سے تشبیہ دی ہے اور کہا ہے کہ تمہارا ظلم کسی کا جوان بیٹا چھین کر بھی ختم نہیں ہوتا۔ رات کو ستاروں کی چمک دمک وہی کی وہی رہتی ہے۔ شاعر چاند کو چودھویں رات میں چمکتے ہوئے دیکھ کر بھی حیران ہے مگر موت کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ شاعر کہتا ہے کہ اس اندوہناک حادثے کی وجہ سے زمین ہل جانی چاہیے تھی، یہ چرخِ نیلی فام لرز کے رہ جانا چاہیے تھا مگر چار دن کے بعد وہی دنیا کے ہنگامے دوبارہ شروع ہو جاتے ہیں وہ روشن چاند جیسا نوجوان جو بزم کو سجا دیتا تھا، اس کی گفتگو روح کو نغمہ وساز سی محسوس ہوتی تھی۔ اُس کا ہر پل شرم وحیا اور غیرت سے لبریز موجِ نسیم کے جھونکوں کی طرح تھا مگر آج میں نے اُس کے مرنے کی خبر سنی ہے۔ شاعر نے اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ اب آنسو بہانا دن کو خاموش رہنا راتوں کو غم میں پیچ وتاب کھانا فضول ہے۔ پوری دنیا کو اپنے غم کی کہانی سنانا بھی فضول ہے کیوں کہ دنیا کے رونے رُلانے سے کچھ حاصل نہیں مگر آخری شعر میں شاعر نے نہایت اہم نکتہ بیان کر کے شخصی مرثیے کا اختتام کیا ہے۔ میرے رونے دھونے کی وجہ یہ ہے کہ انسان موت کے سامنے کس قدر بے بس اور لاچار ہے۔ ہر وقت اُس کا نالہ وفریاد جاری ہے مگر بے اثر اور قبول ہونے سے کوسوں دور ہے۔ احسان دانش کے مرثیے میں تخلیقی انفرادیت اور تفکر اُس کے گہرے ادراک کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے خوب صورت اور منفرد تراکیب استعمال کی ہیں مثلاً ماتم سرائے کائنات، سراب دل نشیں، فروغ بے ثبات، شام نحس، فرعون سامانی وغیرہ، شاعر نے مرنے والے کی ماں، بیوی اور بھائی کے دُکھ کے وہ منظر دکھائے ہیں کہ اُن کی تصویریں نگاہوں کے سامنے آموجود ہوتی ہیں۔ جذبات کی صنعت گری اور منظر آرائی کے لاتعداد مرقعے بنائے ہیں۔ اسی طرح تشبیہات بھی نہایت خوب صورت ہیں۔ رخشندہ قمر، نغمہ داد، موجِ نسیم مشکبو وغیرہ احسان دانش نے شخصی مرثیے کے فن کو نئے قالب میں ڈھالا ہے۔ انہوں نے تلمیح کے طور پر 'جذبہ یعقوب' کو استعمال کیا ہے۔ احسان دانش کے شخصی مرثیے میں حزنیہ پہلو نہایت نمایاں ہے کیوں کہ مرثیے کا مقصد ہی حزن وملال کو زبان دینا ہوتا ہے۔ یہی کیفیت اُن کے ایک اور شخصی مرثیے 'آہ ابوالکلام آزاد' میں بھی نظر آتی ہے جب وہ کہتے ہیں کہ:

نہ ہو حیات میں کیوں ماتم حیات کا رنگ
ابوالکلام سرِ بزمِ روزگار نہیں
یہ ایسی شمع بجھی ہے ارے معاذ اللہ
نظر میں صرف اندھیرا ہے رہگزار نہیں (۸)

احسان دانش چونکہ غزل کے شاعر بھی ہیں، غزل کی اس ریاضت کو انہوں نے اپنے مرثیے میں نہایت مشاقی

کے ساتھ منتقل کیا ہے۔اس قدر رجان دار شعریت کے ساتھ مرثیوں کے قالب تیار کیے ہیں کہ غزل کا حسن اُردو شخصی مرثیے کے رگ وریشے میں اُتر ایا۔اُنہوں نے تغزل کی حساس کیفیتوں کو ایک دل آویز لہجے کے ساتھ مرثیے کے مضامین سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

حوالہ جات

۱،۲۔ احسان دانش،فصل سلاسل ،(لاہور:نقوش پریس،۱۹۸۰ء)،ص۱۱۴

۳۔ احسان دانش،مقامات،(لاہور: مکتبہ دانش،س۔ن)،ص۸۱

۴۔ ایضاً،ص۲۰۷

۵۔ ایضاً،ص۱۶۰

۶۔ احسان دانش،فصل سلاسل،ص۱۱۸

۷۔ ایضاً،ص۱۰۱

۸۔ ایضاً،ص۲۰